ریحان احمد یوسفی

عروج وزوال کا قانون ـــــ تاریخ کی روشنی میں

(۷)

پاکستان اور عروج وزوال کا قانون

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس باب میں ہم پاکستانی قوم کے حالات اور تاریخ کا تفصیلی جائزہ لیں گے اور عروج وزوال کے ضابطوں کا اس پر اطلاق کرتے ہوئے اصلاح احوال کا ایک لائحۂ عمل تجویز کریں گے۔ اس عمل میں ہمیں نہ صرف عام اقوام کے بارے میں بیان کیے گئے پہلے باب کے مباحث کو ذہن میں رکھنا ہوگا، بلکہ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ پاکستانی قوم ایک معاہد قوم ہے جس نے خدا کے ساتھ باقاعدہ ایک عہد باندھ کر اپنا وجود حاصل کیا ہے۔ وہ عہد یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ایک خودمختار خطۂ زمین دے تو ہم دنیا کے سامنے ایک حقیقی اسلامی معاشرے کا نقشہ پیش کر کے دکھائیں گے۔ ہم پچھلے باب میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو مسلمان پیدا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خدا کے محبوب ہیں، بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ان کے ذریعے ایک خداپرستانہ معاشرہ لوگوں کے سامنے قائم رہے۔ اہل پاکستان دوسرے مسلمانوں کی طرح اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے پابند ہیں، مگر انھوں نے ایک عام اسلامی ذمہ داری کو عہد کی شکل دے کر اپنے معاملے کو خاص کر لیا ہے۔ کوئی فرد یا طبقہ ہمارے اس مقدمے کو اگر نہیں مانتا تب بھی وہ اپنے مسلمان ہونے کا منکر تو نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے اس اقرار کے بعد خداپرستانہ معاشرہ قائم کرنا بہرحال مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ البتہ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل واضح ہے کہ ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ'' کا نعرہ لگا کر جو ملک حاصل کیا گیا، اس کے باسیوں کے لیے توحید سے وفاداری اور شریعت کی پاس داری سے بھاگنے کا مطلب تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

پاکستانی قوم تاریخ کے آئینے میں

ہم پہلے باب میں قوموں کی زندگی میں آنے والے مختلف مراحل کو بالتفصیل بیان کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک قومی ترقی کا لائحۂ عمل درست طور پر تجویز کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ حتمی طور پر معلوم ہو کہ قوم اپنی زندگی کے کس مرحلہ میں ہے۔ پاکستانی قوم کے معاملے میں اس چیز کا جاننا بہت مشکل نہیں، کیونکہ پاکستانی قوم ایک جدید تاریخی قوم ہے۔تاریخی قوم سے ہماری مراد ایک ایسی قوم ہے جو توالد و تناسل کے فطری طریقے کے بجائے تاریخی عوامل کے نتیجے میں، مختلف گروہوں کے ملاپ سے وجود میں آتی ہے۔ دوسری چیز جو اس ضمن میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ قوم کے اجتماعی مزاج کا تجزیہ کیا جائے۔ اس کے فاسد عناصر کی بیخ کنی کی جائے اور صالح عناصر کو فروغ دیا جائے۔ اس مختصر کتاب میں ممکن نہیں کہ ہم اس خطے کی تاریخ کو تفصیل کے ساتھ بیان کریں، اس لیے ہم تاریخی تفصیل کے بجائے تاریخی پس منظر کی روشنی میں ہندوستان کی مسلم قومیت کے ارتقا اور اس کے اجتماعی مزاج کے اہم عناصر بیان کریں گے۔ اس بحث کی تفہیم کے لیے بہتر ہو گا کہ قومی زندگی کے مراحل کی اس تفصیل کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جسے ہم نے کتاب کے آغاز میں بیان کیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دور تشکیل: محمد بن قاسم (۷۱۱ء) سے اورنگ زیب (۱۷۰۷ء) کے عہد تک

مسلمانوں نے بحیثیت فاتح پہلی دفعہ محمد بن قاسم کی زیر قیادت ۷۱۱ء میں دیبل کے راستے ہندوستان میں قدم رکھا۔ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم سندھ اور ملتان تک جا پہنچے۔ اس کے حسن سلوک کی بدولت فاتحین نے دھرتی کے بعد لوگوں کو بھی فتح کرنا شروع کر دیا، مگر اس سے پہلے کہ اسلام کی کرنیں اس پورے برعظیم کو روشن کرتیں، سلیمان جیسا خود پرست اور کوتاہ نظر شخص خلافت دمشق کے تخت پر فائز ہوا۔ ذاتی عناد میں اندھا ہو کر اس نے اندلس اور سندھ کے فاتحین ہی نہیں، بلکہ اسلام کی تاریخ اور ان خطوں کی تقدیر کو بھی اپنے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کر دیا۔ اس نے اندلس اور سندھ کے عظیم فاتحین کو واپس بلا کر قید اور موت کے حوالے کر دیا، جس کے بعد ان علاقوں میں صدیوں کے لیے اسلام کی پیش قدمی رک گئی۔ اور جب صدیوں بعد شروع ہوئی تو براعظم یورپ اور برعظیم ہند کے دوسرے کناروں سے۔ جب مشرقی یورپ کو عثمانی ترکوں اور شمال مغربی ہندوستان کو افغان سرداروں نے فتح کیا، مگر ان کی کامیابیاں زمینی فتوحات تک محدود رہیں اور قرون اولیٰ کی طرح انسانی دلوں کو فتح نہ کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب مسلمانوں کی تلوار کمزور ہوئی تو غیر مسلموں نے بلا تاخیر انھیں اقتدار سے باہر کر دیا۔

محمد بن قاسم کے تقریباً تین سو سال بعد ہند پر مسلمانوں کی دوسری یلغار کا آغاز ہوا۔ ۹۹۴ء سے ۱۰۲۱ء تک سبکتگین اور محمود غزنوی کے حملوں کے نتیجے میں پشاور اور لاہور تک مسلمانوں نے قدم جما لیے، لیکن ہند کی پہلی مسلم حکومت ۱۱۹۳ء میں سلطان محمد غوری نے قائم کی۔ ۱۲۰۶ء سے لے کر ۱۵۲۶ء تک سلاطین دہلی کا زمانہ ہے جس میں خاندان غلامان کے علاوہ خلجی،

تغلق، سادات اور لودھی خاندان تخت دہلی پر براجمان رہے۔ بیچ میں تیمور نے یہاں چنگیزی بربریت کا بازار گرم کیا۔ آخر کار ۱۵۲۶ء میں بابر نے عظیم مغل حکومت قائم کی جس نے ہند میں مسلم اقتدار کو اس کی آخری بلندی پر پہنچا دیا۔ اس سلسلہ کی آخری عظیم کڑی اورنگ زیب عالم گیر (متوفی ۱۷۰۷ء) تھا۔ اس عالی ہمت حکمران کے ساتھ ہی باہر سے آنے والے مسلم حکمرانوں کے اقتدار کا سورج گہنا گیا۔

۷۱۱ء سے ۱۷۰۷ء تک کے قریباً ہزار سالہ دور میں برصغیر میں ایک جدید قوم کا ظہور ہوا جو اپنے مذہب، تہذیب، تمدن، روایات، نظام اخلاق اور ثقافت کی بنیاد پر اپنی ایک الگ شناخت رکھتی تھی۔ اس کا پہلا اظہار اس وقت ہوا، جب اکبر اعظم نے ہندوستان کو ایک اکائی جان کر یہاں ایک متحدہ قومیت کو، اپنے دیے ہوئے دین اکبری کی بنیاد پر، فروغ دینا چاہا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اس مسلم قوم کے تشخص کے دفاع کے لیے جو کچھ کیا، وہ محض ان کا شخصی کارنامہ نہیں تھا، بلکہ ان کے پیچھے اس نئ قوم کے اکابرین بھی کھڑے ہوئے تھے۔ دور تشکیل کا یہی عرصہ ہے جس میں ہند کی مسلم قومیت کے اجتماعی مزاج نے جنم لیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دور تشکیل کا قومی مزاج

اس نئ قوم کی اساس برصغیر پاک و ہند میں بسنے والے ان مسلمانوں نے رکھی جو خود کو اس خطے کے ہندوؤں سے الگ اور ایک مختلف جداگانہ تشخص کا حامل سمجھتے تھے۔ اس جداگانہ تشخص کی بنیاد ان کے مذہب اسلام میں تھی۔ اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نہ صرف حیات و کائنات کے بارے میں ایک مکمل نقطۂ نظر رکھتا ہے، بلکہ اپنے پیروکاروں کو عملی زندگی میں ہر آن اس نقطۂ نظر سے متعلق بھی رکھتا ہے۔ وہ مذہب کو تہذیب بنا دیتا ہے۔ مثلاً اسلام میں توحید کی تعلیم نہ صرف اس کی بنیادی کتاب قرآن کریم میں ابدی طور پر درج ہے، بلکہ نماز کی صورت میں دن میں پانچ دفعہ اس کا بھرپور اظہار کرنا مسلمانوں کی انتہائی مضبوط روایت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام کے پیروکار، یعنی مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ رہ تو سکتے ہیں، ان میں جذب نہیں ہو سکتے۔

برصغیر میں اس چیز کو جس حقیقت نے اور زیادہ مستحکم کیا، وہ یہ تھی کہ مسلمان اس خطے میں نہ صرف فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور انھوں نے ہزار سال تک یہاں حکومت کی، بلکہ قلبی طور پر ہمیشہ وہ مسلمانوں کی مرکزی جمعیت، یعنی خلافت سے منسلک رہے۔ اس بات کی اہمیت یوں بھی بہت زیادہ ہے کہ اس پورے عرصے میں مسلمانوں کی تینوں خلافتیں، یعنی بنو امیہ، بنو عباس اور عثمانی خلافت دنیا کی سپر پاورز تھیں۔ جن سے تعلق کا اظہار بہر حال باعث افتخار تھا۔ اس کے علاوہ متعدد وجوہات کی بنا پر ہندوستان کی طرف بلاد اسلامیہ سے مسلمانوں کی ہجرت کا سلسلہ جاری رہا۔ خاص طور پر جب تاتاریوں نے مشرق وسطیٰ سے وسط ایشیا تک مسلم علاقوں کو تخت و تاراج کر ڈالا تو ان علاقوں کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جان و ایمان بچا کر

ہندوستان آگئی۔ یہ مسلمان اپنے ساتھ اپنا مذہب، تمدن، زبان، تہذیب اور روایات بھی لائے۔ ہندو اکثریت میں گھری اس اقلیت کو اسلام کی کشش نے بہت جلد ایک اکائی میں بدلنا شروع کر دیا اور ان کے باہمی میل جول سے ایک نئی قوم کی داغ بیل پڑنے لگی جو اپنے پس منظر کی بنا پر اپنے ہم وطنوں کے مقابلے میں بقیہ عالم اسلام سے بہت قریب تھی۔

یہ مسلمان چونکہ تاتاریوں کے ہاتھوں اپنی تہذیب و تمدن کو مٹتے دیکھ کر آئے تھے، اس لیے ان میں اپنے مذہب کے فروغ کا غیر معمولی داعیہ موجود تھا۔ مقامی آبادی میں غیر مسلموں کی کثرت نے اس جذبے کو اور مہمیز دی۔ چنانچہ یہ لوگ اسلام کے داعی بن کر مقامی لوگوں میں اپنے اثرات پیدا کرنے لگے، جس کے نتیجے میں اسلام، عوام الناس میں فروغ پاتا رہا۔ ہندووانہ کثرت پرستی کے مقابلے میں عقیدۂ توحید کی سادگی، اور طبقاتی نظام کے مقابلے میں مساوات اور اسی بنیاد پر زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع اسلام کی وہ غیر معمولی کشش ثابت ہوئی جس کی بنا پر اسلام بہت معمولی کوشش سے بڑی سطح پر لوگوں میں پھیل گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ حقیقت کہ اسلام ایک غالب قوم کا مذہب تھا، فروغ اسلام میں بہت معاون ثابت ہوئی۔

یہاں یہ حقیقت ذہن میں رہنی چاہیے کہ محمد بن قاسم کے بعد کسی حکمران نے مقامی لوگوں میں اسلام کی ترویج تو کجا اسلام کے مطابق ایک اچھا مسلمان حکمران بننے کی کوشش بھی نہیں کی، وگرنہ یہ پورا خطہ مصر کی طرح عالم اسلام کا حصہ بن جاتا۔ اس کا ایک ثانوی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اس خطہ کے مسلمانوں میں مذہبی اور سیاسی قیادت کو ایک جگہ دیکھنے کی روایت نہیں رہی، کیونکہ انھیں مذہب جن لوگوں سے ملا، ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا اور سیاسی لوگوں کا طرز عمل بالعموم اسلام کے مثالی رویے سے بہت ہٹ کر تھا۔ چنانچہ آج تک یہاں کے مسلمان اہل مذہب کو، مذہبی بنیادوں پر، اقتدار دینے کے عادی نہیں۔

اس خطے کی ایک بڑی اہم روایت تصوف بھی رہی ہے۔ اس بارے میں تو خیر اب دو آرا پیدا ہو چکی ہیں کہ یہاں اسلام کے فروغ میں اہل تصوف کا کیا کردار تھا، مگر یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مخصوص مذہبی پس منظر کی بنا پر یہاں کے عوام الناس میں تصوف اور اہل تصوف کے بہت اثرات ہوئے۔ مسلم حکمرانوں کے بعض ناپسندیدہ اقدامات کے باوجود یہ اہل تصوف تھے جنھوں نے مقامی لوگوں کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں نفرت کے وہ جذبات نہیں پیدا ہونے دیے جس کے بعد ایک فاتح اقلیت، مفتوح اکثریت کی شدید نفرت کا نشانہ بن کر اپنا وجود کھو دیتی ہے۔

ان سب کے ساتھ یہ بہر حال ایک حقیقت ہے کہ مسلمان یہاں ہمیشہ ایک اقلیت رہے۔ یہ اقلیت نہ صرف اپنے اردگرد پھیلی اکثریت سے کچھ نہ کچھ متاثر ہوئی، بلکہ اکثریت میں سے بھی جو لوگ تبدیلی مذہب کے بعد ان میں شامل ہوئے، اپنے بہت سے اثرات ساتھ لائے۔ چنانچہ مقامی ہندو آبادی کے بہت سے اثرات مسلمانوں پر مرتب ہوئے جس کے مختلف مظاہر کی جھلکیاں ان کی تہذیب، روایات اور مذہبی تصورات میں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

یہاں کی مسلم قومیت کا ایک اہم مذہبی پہلو یہ تھا کہ وہ اس عربی سادگی کے ساتھ یہاں نہیں آئی تھی جو ابتدائی دور کے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مسلمانوں کا خاصہ تھی۔ بلکہ بنوعباس کے دور میں پیدا ہو جانے والا مخصوص فقہی ذہن اپنے ساتھ لائی تھی۔ بعد میں جب مغلیہ دور میں بحری راستے سے حج کا دروازہ کھلا تو لوگ کثرت سے حجاز جانے لگے اور اس کے نتیجے میں حدیث کے اثرات بھی دینی حلقوں میں نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ مقامی اثرات کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کا مذہبی مزاج توہم پرستی، تصوف، فقہ اور حدیث کے تعامل سے وجود میں آیا۔ تاہم ابھی تک ان میں ابتدائی تین چیزوں کا اثر زیادہ تھا۔

اس دور کی بڑی نمایاں خصوصیت علمی جمود ہے۔ دینی اور دنیوی، دونوں اعتبارات سے اس دور میں کوئی نمایاں پیش رفت نظر نہیں آتی۔ دینی علم کی روایت بری بھلی جیسی بھی تھی، مذہبی ضرورت کے تحت بہر حال قائم رہی، مگر دنیوی علوم میں ابتدائی درجہ کی ترقی بھی نظر نہیں آتی۔ مغلیہ سلطنت کے پاس دنیا کے بہترین وسائل تھے۔ ان کے دربار میں یورپ کے لوگ بھی موجود تھے جن سے وہ یورپ میں ہونے والی علمی سرگرمیوں سے آگاہی حاصل کر سکتے تھے، مگر انھیں علم سے زیادہ عمارتیں تعمیر کرنے میں دل چسپی تھی، اس لیے انھوں نے اس سمت میں کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کا نتیجہ آنے والے دنوں میں انھوں نے بھگت لیا۔ دنیوی علوم میں غفلت ایک ایسا ناقابل معافی جرم ہوتا ہے جس کی سزا تاریخ فوراً دے دیتی ہے۔

عوام کی سطح پر اس نئی قومیت کا سب سے بڑا اظہار اردو زبان تھی۔ گو ابھی اسے سرکاری سطح پر وہ حیثیت حاصل نہیں تھی، مگر مختلف پس منظر کے حامل لوگوں کے لیے اردو باہمی رابطہ کا بنیادی ذریعہ بننے لگی تھی، اور ایک وقت آیا کہ اردو مسلم قومیت کی مسلمہ شناخت بن گئی۔

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں صورت حال یہ تھی کہ ہند میں مسلمانوں کے ہزار سالہ خارجی اقتدار کے نتیجے میں ایک مسلم قومیت نے جنم لے لیا تھا۔ اسلام اس کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا اور اسی بنیاد پر اس نے، ہندوستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ، مرکزی قومی دھارے میں جذب ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے دنیاے اسلام سے اپنے تعلق پر فخر تھا اور وہ خود کو ایک بین الاقوامی ملت کا حصہ سمجھتی تھی، مگر اس کے باوجود زمینی حقائق یہ تھے کہ اس نے مقامی ہندو تہذیب کا گہرا اثر قبول کیا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلم ہندو ثقافت کے امتزاج سے اس کا ایک نیا چہرہ ابھر رہا تھا۔ اس میں ہندو کلچر اور اس کی توہم پرستی کے گہرے اثرات بھی تھے اور مسلمانوں کی مروج مذہبیت، یعنی فقہ، تصوف اور ان کے تہذیبی عناصر بھی شامل تھے۔ یہ وہ دور تھا، جب علم کا سورج مغرب سے طلوع ہونے لگا تھا، مگر یہاں جہالت کی تاریک رات اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اہل اقتدار کا مقصد اپنی سلطنت کی توسیع و حفاظت اور اہل علم و مذہب کا کام رائج علوم کی تقلید اور انھیں بیوروکریسی مہیا کرنا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں قوم اپنی زندگی کے دوسرے مرحلے میں داخل ہوئی۔

تعمیر و شناخت کا پہلا دور: ۱۷۰۷ء سے ۱۹۴۷ء تک

تعمیر کا آغاز تخریب سے ہوتا ہے۔ یورپ کا دور تعمیر بھی اس وقت شروع ہوا، جب صلیبی جنگوں میں انھیں مسلمانوں کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہاتھوں بدترین شکستیں ہوئیں۔ یہی ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ ان کے نئے دور کے آغاز کے لیے ضروری تھا کہ پرانی شکستہ عمارت گر جائے۔ چنانچہ ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک انہدام کا یہ عمل پورا ہوا۔ اس دوران میں نئی عمارت کی تعمیر کا آغاز اس امت کے ایک بطل جلیل نے کر دیا تھا۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

ہندوستان پر مسلمانوں کا اقتدار کم و بیش ہزار سال تک رہا، مگر اس اقتدار کا سر چشمہ خارجی تھا، یعنی سارے حکمران باہر سے آئے تھے۔ اورنگ زیب کے بعد اس خارجی قوت کو زوال آنا شروع ہوا۔ یہ دراصل مسلمانوں کے اس بین الاقوامی علمی زوال کا نتیجہ تھا جو بغداد کی تباہی کے بعد شروع ہوا تھا۔ اس کا اثر ہندوستانی مسلمانوں پر بھی پڑا اور وہ بھی شاہ راہ زوال پر گامزن ہوگئے۔ اس زوال کا ایک اہم محرک جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں پھیلنے والی عیش و عشرت کی فضا بھی تھی جس نے مسلمانوں کے قویٰ کو بالکل ضعیف کر دیا۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ مرہٹوں کی جس قوت کو ابدالی نے ایک ضرب لگا کر توڑ ڈالا، اورنگزیب جیسا بہادر حکمران ربع صدی میں اسے کیوں نہ ختم کر سکا؟ بہرحال مسلمانوں کی دنیا پرستی رنگ لائی اور کابل سے برما تک پھیلی مسلم حکومت تھوڑے دنوں میں ہی دار السلطنت دہلی کے اطراف تک محدود ہوگئی۔ اس دور کا ایک جملہ جو زبان زد خاص و عام ہوگیا تھا، صورت حال کی بہت اچھی منظر کشی کرتا ہے، یعنی سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اب یہ بات بالکل صاف نظر آ رہی تھی کہ دہلی میں بھی مسلم حکومت کے اقتدار اور برصغیر میں مسلم قوم کا خاتمہ قریب آ گیا ہے، مگر قدرت کو شاید ابھی اس خطے سے مسلمانوں کا خاتمہ منظور نہ تھا کہ اس دور میں ایک بہت بڑا قائد پیدا ہوگیا۔ ہماری مراد شاہ ولی اللہ سے ہے جو اورنگ زیب کے انتقال سے چار سال قبل ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف اس قوم کی شناخت کو ہندو مرہٹوں کے فوری خطرے سے بچانے کے لیے افغانستان سے احمد شاہ ابدالی کو بلایا، بلکہ اس قوم کے اجتماعی مزاج میں بہت سے تعمیری عناصر داخل کیے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی ذات میں، بلکہ اپنے خانوادے اور پیروکاروں کے ذریعے سے اس خطے میں مسلمانوں کے قومی مزاج کو بہت متاثر کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اس علمی روایت کا احیا ہے جو صدیوں سے مردہ تھی۔ دین پر غور و فکر کی جو روایت انھوں نے ڈالی، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس خطے کے مسلمان فکری اعتبار سے پورے عالم اسلام کے لیے امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک بہت بڑے عالم تھے۔ تصوف اور فقہ کی قدیم روایت کے ساتھ ساتھ انھوں نے قرآن اور حدیث کو بھی قوم کے دینی مزاج میں شامل کیا۔ ان کے کاموں کے نتیجے میں مسلمانوں کے قومی مزاج میں مذہب کے اثرات مزید گہرے ہوگئے۔ نیز ان کے اثر سے پہلی دفعہ مذہبی قیادت نے سیاسی میدان کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی۔

تاہم اس دور کے مسلم معاشرے پر زوال کا وہ عمل شروع ہو چکا تھا جو ایک دفعہ جاری ہو جائے تو بڑے سے بڑا آدمی اسے اپنے منطقی انجام تک پہنچنے سے نہیں روک سکتا۔ چنانچہ اسی دور زوال میں سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید اور ان کے جاں نثار رفقا جیسے لوگ بھی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صحابۂ کرام کے بعد ان کی نظیر نہیں ملتی، اس زوال کو روک نہ سکے۔ دوسری

طرف انگریز اپنی تمام تر علمی و حربی ترقی اور حوصلہ مندی کے ساتھ ہند میں قدم جما چکے تھے۔ مسلمانوں کی خارجی قوت کا یہ زوال ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موقع پر نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ قدرت کا قانون اٹل ہوتا ہے۔ یہ قانون حرکت میں آیا اور گناہ گار و بے گناہ، سب اس قانون کی زد میں آ گئے۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار ہی نہیں گیا، بلکہ ان کے بہترین لوگ اس ہنگامہ کی نظر ہو گئے۔ ہندوستان کا مسلم معاشرہ خاک کا ڈھیر بن گیا۔

تاہم یہ زوال خارجی قوت کا تھا۔ ہندوستان میں ایک مسلم قوم جنم لے چکی تھی جو گرچہ اپنے دور طفولیت میں تھی، مگر تقدیر اس قوم پر مہربان تھی کہ اس موقع پر اس قوم میں ایک بہت بڑا لیڈر پیدا ہوا۔ یہ سر سید احمد خان تھے۔ وہ شاہ ولی اللہ کے بعد اس قوم کے دوسرے بڑے قائد تھے جس نے اس کے قومی مزاج کو بے انتہا متاثر کیا۔ ان سے اختلاف کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ خصوصاً ان کے بعض مذہبی خیالات کے حوالے سے ان پر بڑی تنقید ہوئی ہے۔ ہمیں بھی ان کے بعض مذہبی افکار، بلکہ ان کی قومی رہنمائی کے بعض پہلوؤں سے بھی اتفاق نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس وقت قوم کو ایک واضح نقطۂ نظر اور راہ عمل دی، جب اس کے قویٰ آخری حد تک معطل ہو چکے تھے۔ تاریخ کی روشنی میں ہم نے یہ سیکھا ہے کہ زوال کی اس انتہا پر پہنچے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ قوم کو امید دلا کر متحرک کرنے کا ہوتا ہے...... صحیح رہنمائی کرنے کا نہیں۔ ایک دفعہ قوم میں زندگی کی لہر دوڑ جائے، اس کے بعد غلطیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے، لیکن اگر قوم مردہ ہو تو صحیح یا غلط عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اکثر تو ایسی قوم زندگی کے دھارے سے کٹ کر ماضی کا ایک قصہ بن کر رہ جاتی ہے۔ زوال کی انتہا کو پہنچی ہوئی ایک قوم کو اپنے دور کی سب سے بڑی طاقت کے مقابلہ کی سعی لاحاصل سے ہٹا کر آنے والے دنوں کی تیاری کی مہلت حاصل کرنا، ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ ان کی فکر کا ایک دوسرا پہلو جو بڑا مستحسن ہے، وہ یہ ہے کہ اس پورے عمل میں انھوں نے اسلام کو بالکلیہ رد کرنے کے بجائے اسے اس دور کے علمی انکشافات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ہر چند کہ اس کوشش میں وہ بہت کچھ ایسی باتیں کر گئے جو اسلام سے انحراف کے مترادف تھیں، تاہم جب اس دور کے حالات، ان کے کام کی نوعیت، دین پر اس دور میں ہونے والے محدود کام، انیسویں صدی کی سائنسی فکر اور دیگر عوامل کو ذہن میں رکھا جائے تو اسے بھی ان کے کارناموں کی صف میں ڈالنا چاہیے۔ ان کے بعد آنے والوں نے ان کی تصحیح کر دی، لیکن ان کے اس طرز عمل کے نتیجے میں قوم نہ صرف متحرک ہو گئی، بلکہ اسلام کو اس کے قومی مزاج میں مرکزی حیثیت حاصل رہی، اور یہ ان کی بڑی خدمت ہے۔ اس کے علاوہ یہ انھی کی رہنمائی تھی جس کی بنا پر مسلمانوں نے ہندوؤں سے جدا اپنا ایک تشخص برقرار رکھا، وگرنہ اس دور کی ہماری دوسری قیادت تو ذہناً اس چیز کے لیے تیار تھی کہ انگریزوں کے خلاف جنگ اصل مقصد ہے چاہے، اس کے بعد ہندوؤں کے ساتھ ایک ثانوی درجہ کی حیثیت میں رہنا پڑے۔ ہندوستان جس جمہوری نظام کی طرف بڑھ رہا تھا اور جس طرح ہماری مذہبی قیادت ہندوؤں سے کسی قسم کا معاہدہ کیے بغیر ان کے ساتھ شامل ہو گئی تھی، اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ اس خطے کے مسلمان ہمیشہ کے لیے اپنا قومی وجود کھو دیتے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

سر سید کا ایک اور قومی کارنامہ یہ ہے کہ وہ اور ان کے رفقا نے اردو زبان کو بہت مختصر عرصے میں اس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کی جدید اور ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں آگئی اور اس میں ہر قسم کے مضامین کو ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی، وگرنہ اس سے قبل خواص کے لیے یہ شعر و ادب کی زبان اور عوام کے لیے محض ایک بولی تھی۔ بہت سے لوگوں کو اس حقیقت کا ادراک نہیں کہ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد مسلمان جس طرح فارسی زبان سے کاٹ دیے گئے تھے، اس کے نتیجے میں وہ اپنے بہت بڑے تہذیبی اور علمی سرمایہ سے محروم ہوگئے تھے۔ مگر اردو کی بروقت ترقی نے مسلمانوں کو نہ صرف علمی طور پر بنجر ہونے سے بچالیا، بلکہ ہندوستان کی مسلم قوم کو ایک ترقی یافتہ مشترکہ زبان عطا کی۔ زبان قومی اشتراک کی بہت بڑی وجہ ہوتی ہے۔

سر سید کے کارناموں کے یہ چند پہلو ہیں جن کی بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے باوا آدم ہیں، تاہم ان کی کوششوں کے بعض ایسے پہلو بھی تھے جن کے نتیجے میں ہمارے قومی مزاج میں بعض منفی چیزیں شامل ہوگئیں۔ ان میں سب سے نمایاں مغرب پرستی کا رجحان تھا۔ بدقسمتی سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رجحان کم ہونے کے بجائے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ ایک انتہائی تباہ کن رویہ ہے جس پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔

بیسویں صدی کا نصف اول انسانیت کی تاریخ کا بہت ڈرامائی عرصہ رہا ہے۔ جس میں رونما ہونے والے واقعات کی نظیر پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ دو عظیم اور تاریخ انسانی کی سب سے تباہ کن جنگیں اسی عرصہ میں ہوئیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس خطہ کے مسلمانوں نے علی برادران کی قیادت میں تحریک خلافت میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا۔ اس تحریک کا مقصد خلافت عثمانیہ کا تحفظ تھا۔ یہ اپنا مقصد تو حاصل نہیں کر سکی، مگر اس سے مسلمانان ہند کی امت مسلمہ سے وابستگی کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک تو تاریخ کا یہی وہ مقام ہے جہاں پاکستان کی حقیقی اساسات آسمان اور زمین، دونوں میں نمودار ہوئیں۔ قومی زندگی میں اس تحریک کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مغربیت کا جو فروغ عوام میں شروع ہوا تھا، اس پر بند لگ گیا اور مغرب کے شکنجے میں جکڑے ہوئے پورے عالم اسلام کے برخلاف ہمارے ہاں مغربیت صرف طبقۂ اشرافیہ تک محدود ہوگئی اور مغربی تہذیب کی موجودہ یلغار تک، اس کا نفوذ عوام میں نہیں ہو سکا۔ اس کے علاوہ حکمرانوں کے سامنے کھڑے ہونے کا حوصلہ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خود اعتمادی بھی اسی تحریک کی دین ہے۔

یہی وہ عرصہ ہے جس میں برصغیر کی مسلم قوم اپنے لیے ایک الگ وطن حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی جو سب سے بڑی اسلامی مملکت اور دنیا کی پانچویں بڑی ریاست بھی تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک دفعہ پھر قدرت نے اس قوم میں ایک بہت بڑا لیڈر پیدا کر دیا۔ دنیا اسے سر محمد اقبال کے نام سے جانتی ہے۔ مجدد الف ثانی سے شروع ہونے والے مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کے عمل کو انھوں نے ہی ایک وطن کی صورت دی۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے سے اس خطے کے مسلمانوں کو ایک جوش و ولولہ دیا۔ انھوں نے مغربی فکر پر تنقید کر کے مسلمانوں کو ان کی ذہنی غلامی میں جانے سے روکا۔ انھوں نے ہی اجتہاد کی روایت کو مسلمانوں میں بھرپور طور پر زندہ کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ یہ اقبال تھے جنھوں نے مسلمانوں کے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ایک خودمختار وطن کا تصور دیا، انھی نے اس ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے ایک بہترین قائد، یعنی محمد علی جناح کا انتخاب کیا۔ ان تمام اعتبارات سے اقبال کی خدمات بے مثل ہیں اور بلا شبہ وہ مفکر پاکستان کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ ولی اللہ، ان کے خانوادے، رفقا اور متوسلین، پھر سرسید اور ان کے رفقا کے بعد اقبال نے مسلمانوں کے قومی مزاج کو بہت متاثر کیا، تاہم اقبال نے قوم کے مزاج میں موجود جذباتیت کے عنصر کو بہت بڑھا دیا۔ وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ یہ قوم حال ہی میں ایک بڑے زوال سے گزری ہے۔ زوال کا آنا معمولی بات ہوتا ہے اور نہ بلاوجہ قوم کو زوال آتا ہے۔ زوال کا مطلب یہ ہے کہ قوم مردہ ہو چکی ہے۔ اس مردہ قالب میں نئی روح صرف جذباتی باتوں سے نہیں پیدا کی جا سکتی۔ حقیقت پسندانہ بنیادوں پر اس کی تربیت و تیاری بہت ضروری ہے، تاہم اس سے اقبال کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ تاریخ کے ایک نازک لمحے میں موجود تھے۔ اس زمانے کے حالات کا پہلا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی میں جانے سے بچایا جائے، کیونکہ ایک زوال پذیر قوم اگر کسی دوسری تہذیب کے زیر سایہ آجائے تو پھر لازماً اس کے بہت گہرے اثرات قبول کرتی ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلاؤ۔ ایک الگ وطن کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ قوم کے تن مردہ میں حرارت پیدا کی جائے۔ اس عمل کے نتیجے میں اگر ایک خطۂ ارضی میسر آجاتا ہے تو پھر آنے والوں کے لیے یہ امکان باقی رہے گا کہ وہ ملت کے قومی تشخص کے بارے میں پریشان ہوئے بغیر اس کی تربیت کر سکیں گے۔ ہمارا حسن ظن ہے کہ اقبال کو اس چیز کا احساس تھا۔ ہمیں اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اقبال نے جس طرح قائد اعظم کو اس قوم کے سیاسی لیڈر کے طور پر چنا تھا، اسی طرح انھوں نے قومی تربیت کے لیے ایک اور بڑے آدمی کا انتخاب کیا تھا۔ ہماری مراد مولانا مودودی سے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مولانا بعد میں آنے والے وقتوں میں سیاسی مصالح سے خود کو الگ کر کے قوم کی تربیت کے لیے خاص نہ کر سکے، بلکہ بہت سطحی بنیادوں پر عملی سیاست کے میدان میں اتر گئے۔ جس کے بعد نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس دور میں سیاسی ہنگامہ آرائی بہت زیادہ رہی، لیکن دوسرے میدانوں میں بھی کام کا سلسلہ جاری رہا، اردو زبان کے حوالے سے شعر و ادب کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں۔ مسلمانوں کی علمی اور دینی روایت میں بھی ارتقا ہوا۔ علی گڑھ، دیوبند اور ندوہ صرف تین اداروں کے نام ہی نہیں، بلکہ تین دینی، علمی، تہذیبی روایات کے نام ہیں جو بعد میں پاکستانی قوم کے مزاج پر بھرپور طریقے سے اثر انداز ہوئے۔ یہ بالترتیب مغربیت، قدامت پرستی اور دین و دنیا کی یکجائی میں ڈھل گئے۔ تاہم جیسا کہ ہم آگے بتائیں گے کہ فی الوقت اول الذکر دو انتہائیں ہی باقی رہ گئی ہیں اور عملاً اعتدال کی راہ مفقود ہو چکی ہے۔

بہرحال، قیام پاکستان تک قوم کے مزاج میں جو مزید عنصر داخل ہو گئے، ان میں سب سے اہم مسلم قوم کی مذہبی فکر کو مضبوط علمی بنیادوں کا میسر ہونا تھا۔ علم کی روایت دین و دنیا، دونوں اعتبارات سے مستحکم ہوئی۔ ایک طرف قرآن کریم اور بالخصوص حدیث کا چلن عام ہوا تو دوسری طرف مغربی تعلیم کے زیر اثر ہماری اشرافیہ میں مغربی تہذیب و فکر کا نفوذ بہت زیادہ ہو گیا۔

تاہم ایک بڑا طبقہ ان لوگوں کا تھا جو قدامت اور جدت میں ایک توازن قائم رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔اس عرصہ میں مسلمان اقتدار کے تحفظ سے محروم اور اکثریتی فرقہ کی طرف سے خدشات میں مبتلا تھے،اس لیے ہندوؤں کے بالمقابل ایک قومی عصبیت نے ان تمام اندرونی اختلافات کو ڈھانک دیا جو آنے والے دنوں میں پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آئے۔اس دور میں ہندی مسلمانوں کی طرح پوری ملت اسلامیہ سامراجی شکنجے میں جکڑی جا چکی تھی،اس لیے یہاں کے مسلمانوں نے ان کے درد کو اپنا درد جانا اور امت سے ان کی وابستگی میں اضافہ ہوا،تاہم بدقسمتی سے گہرے تجزیہ کے بجائے مسلمانوں کی قیادت پر جذباتی انداز سے معاملات کو دیکھنے کا رجحان غالب رہا اور وہ یہ نہ جان سکے کہ ماضی میں زوال کیوں آیا تھا اور مستقبل اپنے دامن میں کیا مسائل لیے آ رہا ہے۔

تعمیر و شناخت کا دوسرا دور: ۱۹۴۷ء سے آج تک

قیام پاکستان کے ساتھ اس خطے کی مسلم قومیت کو ایک الگ وطن اور علیحدہ شناخت مل گئی۔ایک عظیم تہذیب،ایک سپر پاور کے ظہور کے تمام امکانات جمع ہو چکے تھے۔یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ جب اسے سنبھالا نہ گیا تو اس کا ردعمل شروع ہوا اور آخر کار قوم کو ایک دوسری انتہا تک لے گیا۔بدقسمتی سے ہم اس بلند چوٹی کو عبور کرنے کے بعد اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ہم لڑکھڑا کر گرے اور دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ہمارے قومی خمیر میں بتدریج کچھ ایسے منفی عناصر جمع ہو گئے جو نتائج کے اعتبار سے تباہ کن ثابت ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ان میں قومی جوا کے سے سب سے نمایاں چیز قومی عصبیت کی جگہ علاقائی عصبیت کا فروغ تھا۔جس کے نتیجے میں صرف ربع صدی میں بنگلہ قومیت کی بنیاد پر ہمارا ایک حصہ ٹوٹ کر علیحدہ ہو گیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تحریک پاکستان کو اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو یہ ملی بنیادوں پر ایک قوم کی تشکیل اور اس کے لیے جغرافیہ کے حصول کا عمل تھا۔اس عمل کے بنیادی محرکات دو تھے:ایک اسلام سے وابستگی اور دوسرے ہندو اکثریت کا خوف۔قیام پاکستان کے ساتھ ہی دوسرا محرک جو زیادہ قوی تھا،ختم ہو گیا،جبکہ پہلے محرک کا شعور ابھی اتنا مضبوط نہ ہوا تھا کہ تنہا ایک نئی قوم کی تعمیر کر سکتا۔اسلام کی واحد مشترکہ اساس جس پر پاکستانی قوم کی تعمیر و تشکیل کی جانی تھی،اس کا گہرا شعور مسلم اکثریت کے ان علاقوں جن میں پاکستان قائم ہوا،موجود نہ تھا،اور اس کا سبب یہ تھا کہ یہاں کے مسلمان تعمیر ملت کے اس پورے عمل میں شریک ہی نہیں تھے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔

مسلم سلطنت کے آغاز ہی سے مسلم اقتدار کا مرکز ان علاقوں میں رہا جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔مسلمانوں نے وہیں عروج حاصل کیا،وہیں زوال آشنا ہوئے اور تعمیر ملت کا کام شروع ہوا تو اس کا مرکز بھی وہی علاقے رہے۔مسلم اکثریت کے علاقے ہندوستان کے وہ سرحدی صوبے تھے جہاں ابتدائی دور میں اہل علم و فضل اور مہاجرین کی آمد کے نتیجے میں اسلام تیزی سے پھیل گیا،مگر بعد میں یہ علاقے،مسلم سلطنت کا مرکزی حصہ نہ ہونے کی بنا پر،اہل علم و فضل کا مرکز نہ رہے اور نہ یہاں کے

لوگوں کی تربیت ہوسکی۔ خصوصاً بعد کے ادوار میں جب مجدد الف ثانی کے بعد سے ملی تشخص اور اسلامی حمیت کا ایک گہرا احساس نمایاں ہوکر سامنے آنے لگا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سید احمد شہید کے ساتھ جو کچھ ہوا، ایک مسلم اکثریتی علاقے میں ہی ہوا۔

مزید براں یہ کہ ان علاقوں میں جاگیرداری اور قبائلی طرز زندگی کی گرفت بہت مضبوط رہی ہے۔ جاگیردار اور قبائلی سرداروں کو یہ گوارا نہیں کہ ان کے زیر دست علاقوں میں کسی قسم کا بھی شعور عام ہو، خواہ وہ اسلامی شعور ہی کیوں نہ ہو۔ عوام کے بے شعور رہنے میں ہی ان کا مفاد وابستہ ہے۔ بدقسمتی سے شہری علاقوں کے مقابلے میں ان کی اکثریت ہے، اس لیے قیام پاکستان سے لے کر آج تک یہ لوگ ملک کے سیاسی منظرنامے پر چھائے ہوئے ہیں۔

ان حالات میں قوم کی تعمیر وتشکیل کے لیے دو چیزوں کی موجودگی لازمی تھی: ایک یہ کہ سیاسی قیادت کے پاس قومی تعمیر کا واضح نقشہ موجود ہو، مگر معاملہ یہ تھا کہ پاکستان اتنی جلدی میں بنا کہ تعمیر قوم کا کوئی نقشہ سامنے تھا نہ اسے بنانے کا وقت کسی کے پاس تھا۔ تحریک پاکستان کی بنیاد جذبات پر رکھی گئی تھی۔ مثلاً اسلام کے نفاذ کا جذبہ، ہندوؤں اور انگریزوں سے نجات کا جذبہ۔ تاہم قوم کی تعمیر جذباتیت پر نہیں، ٹھوس منصوبہ بندی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ بالخصوص قوم کے مختلف گروہوں کے حقوق وفرائض کا مسئلہ بڑا اہم ہوتا ہے، مگر پاکستان حاصل کرنے والی قیادت کے پاس اتنا وقت نہیں تھا اور قیام پاکستان کے ساتھ ہی وہ فطری یا غیر فطری موت کے بعد ایسی قیادت کے لیے جگہ خالی کر گئی جو انتہائی نااہل، کم حوصلہ اور مفاد پرست لوگوں پر مشتمل تھی۔ وہ لوگ قومی تعمیر کا صبر آزما کام کیا کرتے جو ایک فالج زدہ گورنر جنرل کو سیاسی عمل میں بے جا مداخلت سے نہ روک سکے۔

دوسری چیز جس کی عدم موجودگی صورت حال کو سنگین کرنے کا سبب بنی، وہ اسلامی بنیادوں پر قومی شعور اور ثقافت کی تشکیل تھی۔ جس طرح ہماری سیاسی قیادت قومی تعمیر کے معاملے میں ناکارہ ثابت ہوئی، اسی طرح ہماری مذہبی اور فکری قیادت اس میدان میں مکمل طور پر ناکام ہوگئی، بلکہ یہ لوگ تو اس کام کی اہمیت کا ادراک بھی نہ کر سکے۔ بدقسمتی سے ان لوگوں نے قوم کے بجائے آئین کو اور اصلاح کے بجائے اقتدار کو اپنی منزل بنالیا۔ یہ لوگ اگر مثبت بنیادوں پر قوم کی تربیت شروع کر دیتے تو قیام پاکستان کے ربع صدی بعد ہماری تاریخ میں ۱۹۷۱ء نہیں آتا، بلکہ قوم کی تعمیر وشناخت کا مرحلہ بہت جلد دور ترقی واستحکام میں تبدیل ہوجاتا، مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا۔ ملی احساس کو جب شعوری بنیادیں میسر نہ ہوئیں تو قومی یکجہتی مدھم پڑنے لگی۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ مغربی پاکستان کی کوتاہ بین سیاسی قیادت نے بنگالی اکثریت میں شدید احساس محرومی پیدا کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قوم اور جغرافیہ، دونوں تقسیم ہوگئے۔ سقوط ڈھاکہ کے نتیجے میں ہماری قومی عصبیت کے پرخچے اڑ گئے۔ وہ عصبیت جس کے بغیر کوئی قوم دنیا میں سرفرازی حاصل نہیں کر سکتی۔ بدقسمتی سے سیاسی، مذہبی اور فکری طبقات اپنی پرانی روش پر ابھی تک گامزن ہیں، اس لیے بچے کھچے پاکستان میں بھی قومی عصبیت کے بجائے صوبائی اور لسانی عصبیت غالب ہے اور یہ رجحان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

مغربیت اور اسلام پسندوں کی کشمکش

قومی زندگی کے ساتھ مزید حادثہ یہ ہوا کہ مغرب پسند اشرافیہ اور سیاسی قیادت کا ٹکراؤ فکری اور مذہبی قیادت سے شروع ہو گیا۔ ان کے ٹکراؤ سے نہ صرف قومی تعمیر و ترقی کا عمل متاثر ہوا، بلکہ ہمارے قومی مزاج میں دو انتہائی تباہ کن رجحانات داخل ہوتے چلے گئے۔ ایک مغربی فکر و عمل کا معاشرے میں نفوذ دوسرے مذہبی جمود اور انتہا پسندی کا فروغ۔ یہ بات چونکہ بڑی اہم ہے، اس لیے ہم اس کی ذرا تفصیل بیان کرنا چاہیں گے۔

تحریک پاکستان میں اسلام کا نعرہ لگنے سے ہماری مذہبی قیادت کو یہ خیال ہوا کہ یہاں کے عوام اجتماعی زندگی میں اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں۔ دوسری طرف اقتدار ایسے مغرب پرست لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو نفاذ اسلام کی اہلیت رکھتے ہیں اور نہ اس میں مخلص ہیں۔ چنانچہ اقتدار ان سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے۔ بدقسمتی سے ان دونوں باتوں سے متعلق بعض اہم پہلو ان کی نظر میں نہ رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے مقتدر طبقات ذہناً مغرب سے مرعوب تھے اور ہیں، مگر اسلام کا جو تصور مذہبی طبقات پیش کرتے رہے ہے، اس سے متعلق بعض حقیقی سوالات تھے جن کا مدلل اور تسلی بخش جواب دینا اہل مذہب کی ذمہ داری تھی جسے پورا کیے بغیر انھیں مغرب کی ذہنی غلامی سے نکالنا ممکن نہ تھا۔ اس کے بجائے ہمارے اہل علم نے مغربی معاشرے کے بعض منفی پہلوؤں کو اجاگر کر کے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ انھوں نے مغرب زدہ اشرافیہ پر اتمام حجت کر دیا ہے۔ حالاں کہ یہ روش دانائی ہی کے نہیں خیر خواہی کے بھی اس جذبے کے خلاف تھی جو پیغمبرانہ دعوت کا شیوہ رہا ہے۔ دوسری طرف عوام کے بارے میں بھی ان کا اندازہ درست نہ تھا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ عوام الناس کی تربیت نہ ہونے کی بنا پر اسلام سے ان کی وابستگی جذبات کی حد تک تھی اور ان کا اسلامی شعور بہت پختہ نہ تھا۔ مزید یہ کہ صرف مذہبی بنیادوں پر دینی قیادت کو سیاسی اقتدار دینا اس قوم کی روایت نہ تھی۔ چنانچہ انھیں مؤثر عوامی تائید نہ مل سکی۔ اقتدار کے سرچشموں کو بھرپور عوامی تائید کے بغیر ہٹانا ممکن نہیں ہوا کرتا۔ ان حقائق کو نظر انداز کر کے مغرب زدہ اشرافیہ کے خلاف محاذ قائم کر لیا گیا۔ جس کے نتیجے میں ایک بے فائدہ ٹکراؤ شروع ہو گیا۔

اہل مذہب کی پالیسی شروع دن سے یہ رہی کہ دستور کی سطح پر اسلامی احکامات کے نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔ وہ بھول گئے کہ قوم دستور سے نہیں، بلکہ دستور قوم سے بنتا ہے۔ بہرحال آئین کی کاغذی سطح پر مغرب زدہ اشرافیہ نے اسلام کی رسمی موجودگی کو گوارا تو کر لیا، لیکن معاشرتی سطح پر انھوں نے خواتین کے حقوق اور پردہ وغیرہ کے عنوانات سے بعض مباحث چھیڑ دیے۔ تاہم میڈیا کی طاقت نہ ہونے کی بنا پر ان کے اثرات زیادہ نہ بڑھ سکے۔ دوسرے یہ کہ ان کا جواب دینے کے لیے علما نے ایک بھرپور اور منظّم علمی تحریک چلائی جس نے ان کے تھوڑے بہت اثرات کو بھی غیر مؤثر کر دیا۔ ایوب خان کے دور میں قانون کی سطح پر کچھ ایسے اقدامات کیے گئے جو رائج اسلامی تصورات سے بعید تھے، تاہم عوام میں مغربیت کے نفوذ کی کوئی کوشش ابھی

تک کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ دوسری طرف دستوری سطح پر اسلام کی اہمیت کو چیلنج نہیں کیا گیا۔ یہ صورت حال آج کے دن تک برقرار ہے۔اس کے دو تین اسباب ہیں: ایک تو تحریک پاکستان کا پس منظر، دوسرے عوام الناس کی اسلام سے جذباتی وابستگی اور تیسرے یہ حقیقت کہ بہر حال ہماری اشرافیہ نظریاتی طور پر ہی سہی اسلام کے دین حق ہونے کی قائل ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال غلام احمد پرویز صاحب کا اشرافیہ میں نفوذ تھا۔ پرویز صاحب کا نقطۂ نظر ایک جملے میں اگر بیان کیا جائے تو وہ اس طرح ہے کہ ہر حقیقت قرآن کی بارگاہ میں سجدہ کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب کبھی قرآنی بیانات اور مغربی مسلمات میں ٹکراؤ ہوتا تو وہ اپنی مخصوص لغت کی مدد سے قرآن کو مغربی افکار کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے خیالات دراصل اشرافیہ کے اس ذہن کے عکاس تھے کہ اسلام حق تو ہے، مگر اس کی کوئی ایسی بات قابل قبول نہ ہوگی جو مغربی اقدار اور روایات کے خلاف ہو۔ چنانچہ اسلام کی وہ تعبیر ہماری اشرافیہ کو بڑی پسند آئی جس میں اسلام کے حق ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں تھا، مگر زندگی کے عملی میدان میں اس کا کوئی کردار نہ تھا۔

تاہم جب ٹی وی کا آغاز ہوا تو صورت حال میں آہستہ آہستہ تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ یہ بات اب ریکارڈ پر آچکی ہے کہ مقتدر طبقات کے ذہن میں ٹی وی کو معاشرے میں متعارف کرانے کا پس پردہ مقصد یہ تھا کہ مغربی اقدار کو معاشرے میں رائج کیا جائے۔ ٹی وی کو عام ہوتے ہوتے مزید دس سال بھٹو صاحب کے دور میں لگے۔اس دور میں پوری قوت کے ساتھ ٹی وی کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا، تاہم مقتدر طبقات اس معاملے میں ذرا جلدی کر گئے۔ چنانچہ ربع صدی قبل جب وہ کچھ سرکاری ٹی وی پر نشر ہونے لگا جو آج بھی نہیں ہوتا تو ردعمل ہونا لازمی تھا۔ یہی ردعمل آگے بڑھا اور ضیاء الحق کے اسلامی نظام کی صورت میں ظاہر ہوا، جب تحریک پاکستان کے بعد ایک دفعہ پھر اسلام کے نام پر ایک مہم چلائی گئی۔اسی دوران میں ہمارے پڑوس میں ایک دو ایسے واقعات ہوئے جن سے اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک کو بہت مہمیز ملی۔ان میں سے ایک ایران کا اسلامی انقلاب تھا اور دوسرا افغانستان میں روسی فوج کے قبضہ کے بعد جہاد کا آغاز۔

اس دور میں یوں محسوس ہوتا تھا گویا اسلام و مغرب کی اس کشمکش میں مذہبی حلقوں کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوگئی ہے اور مغرب زدہ طبقہ بہت ہی محدود ہو چکا ہے۔ تاہم یہی دور مذہبی حلقوں کے لیے سب سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوا۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی ترکش کا یہ واحد تیر نشانے پر نہ لگا تو لوگوں کی ساری امیدیں ختم ہوگئیں۔اسلام کے نام پر کیے گئے فلاحی ریاست کے وعدے ہوا ہوگئے۔اسلام کے نام پر جو کچھ وجود میں آیا، اس سے معاشرے میں صرف منافقت کا اضافہ ہوا۔ دستوری، معاشی اور معاشرتی سطح پر جو اسلامی اقدامات کیے گئے، ان میں سے اکثر اسلام کی بدنامی کا باعث بن گئے۔اس صورت حال کے نتیجے میں عوام کا اسلام سے وہ رومانس ختم ہوگیا جس کے لیے انھیں نصف صدی سے تیار کیا جا رہا تھا۔

نفاذ اسلام کی ناکامی سے زیادہ بڑا مسئلہ افغان جہاد کی کامیابی نے پیدا کر دیا۔ ہماری مذہبی قیادت کا المیہ ہے کہ یہ بہت سادہ لوگ ہیں۔تحریک پاکستان کی کامیابی سے انھیں یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ اہل پاکستان پکے ''اسلامی'' لوگ ہیں جن کے لیے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مذہب سے بڑا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ افغان جہاد کی کامیابی سے انھیں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ مسلمانوں نے جہاد کے ذریعے سے ایک سپر پاور کو ختم کر ڈالا ہے۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اب جہاد سے تمام مقبوضہ مسلم علاقوں کو نہ صرف بازیاب کرایا جا سکتا ہے، بلکہ دوسری سپر پاور جو اب تنہا سپر پاور تھی، اس کے پرخچے بھی اڑائے جا سکتے ہیں:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

روس کے خلاف جذبہ یقیناً ہمارا تھا، مگر تلوار مغرب کی۔ جب مغرب ہمارے مدمقابل آیا تو طالبان کے اس المیہ نے جنم لیا جس میں سب نے دیکھا کہ بہت بہادر لوگ بھی ''تلوار'' کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد عراق کے سانحہ نے آخری کیل کا کام کر دیا، تاہم ابھی تک بہت سے لوگ ''مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی'' پر یقین رکھتے ہیں۔

بہرحال، جہادی اور نظامِ اسلام پر مبنی فکر نے انتہا پسندی کی ایک زبردست لہر کو فروغ دیا۔ قوم میں موجود جذباتی انداز فکر نے، جس کی موجودگی میں تحقیق و تجزیہ کا مزاج جنم نہیں لے سکتا، اس انتہا پسندی کو بہت فروغ دیا۔ ہمارے بہترین دماغ، زندگیاں اور سرمایہ انتہا پسندی کی نظر ہوگئے۔ جس کے نتیجے میں علمی احیا کا عمل بدترین جمود میں بدل گیا۔ اور اب ان دونوں تجربوں کی مکمل شکست کے بعد بھی اس فکر کے پیش کرنے والے اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں اول یہ کہ ہر سمجھانے والے کا منہ بند کرنے کے لیے ایک بہت آسان راستہ دستیاب ہے، وہ یہ کہ اسے منکر جہاد، منکر اسلام، مغرب کا ایجنٹ قرار دے دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ جان سے مار دینے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ بدقسمتی سے ہمارے اہل علم کو سیرت پاک کے اس پس منظر سے غلط فہمی ہوگئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں ہی عرب پر اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ آپ جیسی جدوجہد کر کے ہم بھی اقتدار حاصل کر سکتے ہیں اور اس طرح اسلام کا غلبہ ممکن ہو جائے گا۔ یہ ایک اجتہادی خطا تھی۔ جیسا کہ ہم نے پیچھے بیان کیا ہے کہ یہ دراصل رسولوں کے باب میں خدا کا قانون تھا جو عام قوانین کو معطل کر کے حرکت میں آیا تھا۔ جس میں اتمام حجت کے بعد تمام تر بے سروسامانی کے باوجود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی قوم کے خلاف کامیابی یقینی تھی، حتیٰ کہ اپنے معاصرین کے خلاف صحابۂ کرام اور بنی اسرائیل کے جہاد کی نوعیت بھی ہم نے واضح کر دی کہ یہ بھی آسمانی رہنمائی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا اور ختم نبوت کے بعد اس طرح کے جہاد کا دروازہ بھی بند ہو گیا ہے۔

یہ تو مذہبی انتہا پسندی کی کہانی تھی۔ دوسری طرف نوے کی دہائی شروع ہوئی تو تاریخ کا ایک عظیم انقلاب آیا، یعنی انفارمیشن ایج کا آغاز ہوا۔ اس کے نتیجے میں دنیا حقیقی معنوں میں ایک بین الاقوامی گاؤں بن گئی۔ مغرب کی تہذیب جو سوویت یونین کے خاتمے اور گلف وار میں اپنی فتح کے بعد خود اعتمادی کے نشے سے چور تھی، دنیا میں اپنے سیاسی، معاشی اور سب سے بڑھ کر تہذیبی و فکری غلبہ کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ تادم تحریر اسے تینوں محاذوں پر شان دار کامیابی نصیب ہو رہی ہے۔ حالات یہ

www.javedahmadghamidi.org

بتا رہے ہیں اور جائزے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان کے سیاسی اور معاشی غلبے پر تو اہل اسلام اور دیگر لوگوں کو کچھ تشویش ہے، مگر ان کے تہذیبی غلبے کو سب لوگ خوش دلی سے قبول کر رہے ہیں۔

پیو گلوبل ایٹیٹیوٹ پراجیکٹ سروے کے مطابق ایک امریکی ادارے نے دنیا کے ۴۴ ملکوں کے ۳۸ ہزار افراد کے انٹرویو کیے، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پوری دنیا خاص طور پر مسلم ممالک میں امریکا مخالف جذبات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ سروے کے مطابق پاکستان کے ۶۹ فی صد لوگ امریکا سے نفرت کرتے ہیں جو کہ دنیا بھر میں دوسرے نمبر پر ہے۔ ہم جس چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ جائزے کے مطابق اس نفرت کے باوجود لوگوں کی ایک بڑی تعداد امریکی ٹی وی، فلمیں اور موسیقی پسند کرتے ہیں۔ یہ جائزہ نہ بھی ہوتا تب بھی پاکستان کی حد تک ہم میں سے ہر باخبر شخص اس رجحان سے اچھی طرح واقف ہے کہ کس طرح امریکی فلمیں اور موسیقی ہمارے ہاں پسند کی جاتی ہے۔ امریکی فاسٹ فوڈ اور مشروبات ہمارے ہاں بے انتہا مقبول ہیں۔ ان کے تنگ و مختصر لباس ہمارے مردوں سے گزر کر عورتوں میں بھی عام ہو رہے ہیں۔

ہمارا مقصود اس حقیقت کا بیان ہے کہ اگر امریکا اور مغرب کو سیاسی اور معاشی میدان میں شکست ہو گئی، گو اس کے امکانات بہت روشن نہیں، تب بھی ان کا تہذیبی غلبہ بغیر کسی نمایاں مزاحمت کے دنیا بھر میں بشمول پاکستان پھیلتا رہے گا۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ وی سی آر کے بعد پہلے ڈش اور اب انٹرنیٹ اور کیبل کے ذریعے مغربی افکار و خیالات اور اقدار و روایات ہمارے معاشرے میں علانیہ ہجوم کر رہے ہیں اور کامیابی سے ہمارے گھروں کو فتح کر رہے ہیں۔ دوسری طرف مغرب کی تہذیبی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہندوستانی میڈیا نیز خود ہماری اشرافیہ اور میڈیا کے لوگ مغربیت کو ہمارے گھروں میں ہماری زبان میں پھیلا رہے ہیں۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ پاکستانی معاشرہ مغربی تہذیب سے مفتوح ہونے کے قریب ہے۔ اہل مغرب نے اپنے دور حکومت میں ہماری اشرافیہ کے اذہان کو تسخیر کیا تھا۔ اب لگتا ہے کہ ہمارا پورا معاشرہ، ایک محدود اقلیت کو چھوڑ کر، ان کے رنگ میں رنگنے کے لیے تیار ہے۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اہل مغرب کی نقالی ان کی تہذیب اور کلچر کے اعتبار سے تو کرنے کے لیے مستعد ہیں، مگر اجتماعی زندگی کے بارے میں ان کی ذمہ دارانہ روش اور اخلاقی خوبیاں اخذ کرنے کے معاملے میں بالکل پیچھے ہیں۔ وہ بے شک مادہ پرست ہیں، مگر ان کی اکثریت اجتماعی معاملات میں اعلیٰ اخلاقی روش کی پابند ہے، مگر ہم اسلام کے نام لیوا ہونے کے باوجود اجتماعی اخلاقیات کے بارے میں ہر سطح پر بدترین روش کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مسلم قوم کی عصبیت کے خاتمے، انتہا پسندی اور مغربیت کے فروغ کے ساتھ ساتھ یہ اخلاقی انحطاط، بلاشبہ قومی سطح پر ہمارا سب سے بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔

کیا کوئی امید باقی ہے؟

پہلے باب میں عروج و زوال کے محرکات کے حوالے سے ہم نے جن عناصر کا ذکر کیا تھا، ان میں سے دو غیر اختیاری

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org